

جمہوریت یا اسلام؟

فرقہ اہل حدیث کے ترجمان، ماہنامہ محدث (لاہور) نے (جنوری۔ فروری ۱۹۸۱ء) کا ایک خاص نمبر شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے ”جمہوریت یا اسلام“۔ اس میں سے چند ایک چیدہ چیدہ نکات پیش رفتہ قارئین کے جاننے ہیں جو گہرے غور و تدبر کے مستفاد ہیں۔

۱) قانون سازی کا اختیار

نظام خلافت میں مقتدر اعلیٰ خود اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی ہر چیز کا مالک اور وہی قانون ساز ہے۔ ملت اسلام اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے بنیادی قوانین اللہ تعالیٰ خود بخود انبیاء و انساؤں کو بتلاتا ہے۔ ایسی قانون سازی کا اختیار کسی نبی کو بھی نہیں ہوتا۔ (ص ۱۹۹)

(ب) اسلامی نقطہ نظر سے کسی فرد کو یا ادارہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خدائی قوانین میں ترمیم و تنسیخ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ ہی قانون ساز ہے۔ کسی دوسرے کو قانون سازی کا اختیار حاصل نہیں۔ اور نہ خدا کے بنائے ہوئے قانون میں رد و بدل کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ نبی بھی ایسا نہیں کر سکتا۔ (ص ۲۰۰)

(ج) اس معاشرہ کا حکمران کوئی مطلق العنان یا مقتدر اعلیٰ شخصیت نہیں ہوتی بلکہ قانونی لحاظ سے وہ عام آدمی کی سطح پر ہی ہوتا ہے۔ اس کی حکمرانی صرف ان معنوں میں ہے کہ وہ خدائی قوانین کی مشرتکہ اطاعت کے لئے طریق کار وضع کرے۔ (ص ۲۰۱)

آپ ان الفاظ پر بار بار غور کیجئے کہ

قانون سازی کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔ کسی انسان کو نہیں۔ حتیٰ کہ نبی کو بھی نہیں۔ کوئی انسان خدا کے قوانین میں رد و بدل نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ نبی بھی ایسا نہیں کر سکتا۔

اگر ہم شروع میں یہ نہ بتاتے کہ یہ اقتباسات کہاں سے لئے گئے ہیں تو یقیناً آپ بھی سمجھتے کہ یہ طلوع اسلام کے کسی مقالہ کے اقتباسات ہیں۔ لیکن تا شاید یہ ہے کہ اگر طلوع اسلام بھی کچھ کہے تو منکر حدیث، منکر سنت اور منکر رسالت (فالہذا المحدثون بلے دین) قرار پائے، اور انہی معتقدات کا اظہار، محدث کرے تو حامی حدیث و سنت ٹھہرے!

بہر حال، ہم مؤقر جریدہ محدث کو اس اظہارِ حق پرستی مبارک باوقرار دیتے ہیں۔ اس سے واضح ہو گیا کہ ان حضرات کے نزدیک بھی، اسلام میں ضابطہ قوانین، قرآن مجید ہے اور اس میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا حق (فقہاء و ایک طرف) حضور نبی اکرم کو بھی حاصل نہیں تھا۔ اس سے کتاب و سنت کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ (خود ان حضرات کے عقیدہ یا اعتراض کے مطابق) سنت کی گرد سے نہ تو قرآنی قوانین میں کسی قسم کا اضافہ ہو سکتا ہے، کیونکہ قانون سازی کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اور نہ ہی رد و بدل۔
فالحمد للہ علیٰ ذلک۔

(۱)

۲۔ عبادت کا ترجمہ

طلوع اسلام نے، لفظ عبادت کا ترجمہ، اطاعت یا محکومیت کیا تو شور مچا دیا گیا کہ یہ خدا کی پرستش کا معنی ہے۔ زیرِ نظر محدث اس باب میں لکھتا ہے:-

ملوکیت میں ایک انسان کی غلامی ہوتی ہے۔ جمہوریت میں پارلیمنٹ کی۔ اس طرح دوسرے فقہاء نے حکمرانی میں جو فرد یا ادارہ مقتدرِ اعلیٰ ہوگا، وہ حاکم اور عوام یا رعایا اس کی غلام ہوگی..... خلافت میں امیر اور رعایا پر ایک ہی قانون نافذ ہوتا ہے۔ دونوں اللہ کے بندے اور غلام ہوتے ہیں۔ کوئی انسان کسی حاکم یا ادارے یا دوسرے انسان کا غلام نہیں ہوتا۔ حضور نبی اکرم نے اہلِ مہجران کے نام جو نامہ مبارک لکھا تھا، اس میں درج ذیل الفاظ قابلِ غور ہیں:-

..... أما بعد فانی ادعوکم الی عبادۃ اللہ من عبادۃ العباد.....

اذن بعد تمہیں بندوں کی غلامی سے نجات دلا کر اللہ کی غلامی اور عبدیت کی طرف بلانا

ہوں۔ (ص ۲۱۰)

آپ نے دیکھا کہ عبادت کا مفہوم غلامی یا محکومی بتایا گیا ہے، نہ کہ پرستش۔ اگر یہ حضرات عبادت کے اس مفہوم پر تکیہ نہ کریں تو کتنے الجھاؤ، دُورِ مدِ جہاںیں، غیر قرآنی نظام میں "خدا کی عبادت کا تصور اور امکان ہی نہ رہے! آکا بنا پر ہم تحریک پاکستان کے دوران، ان حضرات سے کہتے تھے کہ متوہ ہندوستان میں، مسلمانوں کے لئے "خدا کی عبادت" کا امکان ہی نہیں۔ وہاں "خدا کی پرستش" ہو سکے گی۔ عبادت (محکومیت) نہیں۔ عبادت کے مفہوم کے اس فرق سے دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مذہب میں خدا کی پرستش ہوتی ہے۔ دین میں اس کی محکومیت۔ سیکولرزم میں خدا کی پرستش کی آزادی مل سکتی ہے۔ خدا کی محکومیت کی نہیں۔

(۲)

۳۔ مشاورت

ہم شروع سے اس حقیقت کو پیش کرتے چلے آ رہے ہیں کہ قرآن کریم کے بنیادی اصولوں (اساسی قوانین و

کی جزئیات (یعنی وہ طور طریق جن کے مطابق ان قوانین پر عمل کیا جائے گا) اسلامی مملکت، اُمت کے مشورہ سے متعین کرے گی۔ محدث میں اس موضوع پر تفصیل بحث کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ خود حضور نبی اکرم نے بھی یہی طریق اختیار کیا تھا کہ ایسا کرنے کے لئے آپ کو خود خدا نے حکم دیا تھا۔ چنانچہ محدث میں، اس قسم کی کئی ایک مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ مثلاً:-

(۱) جنگ بدر کے قیدیوں کا معاملہ۔

(۲) اذان کا تعین۔

(۳) مشاورت متعلقہ غزوہ احد۔ (صفحہ ۱۳۶-۱۳۷)

اسی طرح، خلافت راشدہ کے نظائر کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

محدث کے اس اعتراف سے ایک ایسی بنیادی مسئلہ کا حل مل جاتا ہے جو شروع سے اُمت میں مابہ النزاع چلا آ رہا ہے اور جسے دین کی اساس قرار دیا جاتا ہے۔ اہل حدیث حضرات سورہ النجم کی آیات وَمَا يَنْطَلِقُ الْإِنْشَاءُ إِلَّا مِنْ رُوحٍ قَدُوسٍ (پہلے ۳۱) کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ رسول اللہ کا ہر قول (اور عمل) وحی کی بنا پر ہوتا تھا۔ اسی سے ان کا عقیدہ ہے کہ ایک وحی قرآن کریم میں درج ہے اور دوسری وحی احادیث میں، ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضور کا ہر قول وحی پر مبنی ہوتا تھا تو آپ صحابہؓ سے مشورہ کیوں کیا کرتے تھے، ظاہر ہے کہ جو معاملہ مشورہ کے بعد طے ہوتا تھا، وہ وحی خداوندی نہیں ہوتا تھا۔ حضور کی مشاورت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وحی خداوندی صرف قرآن کے اندر تھی اور اس وحی پر عمل درآمد باہمی مشاورت سے ہوتا تھا جس میں بعض اوقات فیصلہ خود حضور کی رائے کے بھی خلاف طے پاتا تھا۔

اور یہ بھی واضح ہے کہ جو معاملات مشورہ سے طے پائیں، وہ ابدی اور غیر متبدل نہیں ہو سکتے۔ اس سے احادیث کی پوزیشن واضح ہو جاتی ہے۔ اسی بنا پر امام بوصیفہؒ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ

رسول اللہ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ تعین جزئیات (تدوین فقہ) میں صحابہؓ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ اور جس کی رائے بہتر معلوم ہوتی، اسے اختیار فرمایا کرتے تھے۔ اگر میں بھی رسول اللہ کے زمانے میں ہوتا تو اس مجلس مشاورت میں شریک ہوتا۔ اور میرا خیال ہے کہ کئی امور میں حضور میری رائے کو اختیار فرما لیتے۔ (آپ فرماتے کہ) دین اس کے سوا کیا ہے کہ وہ ابھی اور عمدہ رائے کا نام ہے۔

(تاریخ خطیب بغدادی، جلد ۱۳، صفحات ۳۹۰-۳۹۱)

اور اسی سے فقہی قوانین کی پوزیشن بھی واضح ہو جاتی ہے۔ یعنی ابدی اور غیر متغیر صرف قرآن کے احکام و قوانین ہیں۔ حدیث ہو یا فقہ کسی کی حیثیت نہیں۔ قرآنی احکام و اصول اور اُمت کی مشاورت۔ یہ ہے اسلامی نظام!

مشاورت کی اہمیت

اُمت کی مشاورت کی اہمیت کے متعلق، محدث نے دو ایک نہایت اہم احوال درج کئے ہیں۔ (مثلاً)

(۱) حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے کہ لا خلافت الا عن مشورۃ۔ مشاورت کے بغیر خلافت نہیں۔
(۸۳)

حضرت البرہسبی اشعری کا بیان ہے۔

امارت وہ ہے جسے قائم کرنے میں مشورہ کیا گیا ہو اور بادشاہی وہ ہے جس پر تلوار کے زور سے قبضہ حاصل کیا گیا ہو۔ (۸۴)

محدث نے، بخاری کے حوالے سے، حضرت ابو بکر صدیقؓ کی بیعت خلافت کی روئداد طبری تفصیل سے لکھی ہے۔ اس میں حضرت عمرؓ کا یہ قول نمایاں طور پر درج کیا گیا ہے کہ

جس کسی نے مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی کی بیعت کی تو بیعت کرنے والا اور جس کی بیعت کی گئی، دونوں کو قتل کر دیا جائے گا اور (پھر فرمایا) دیکھو! میں پھر... یہی کہتا ہوں کہ جو شخص مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی کی بیعت کرے تو دوسرے لوگ، اس کی پیروی نہ کریں، نہ اُن کی جس کی بیعت کی گئی۔ کیونکہ دونوں اپنی جانیں گنوا بیٹھیں گے۔ (مسند احمد ۲۲)

یہ ہے اسلامی مملکت اور اسلامی نظام کی اصل اور بنیاد۔ یہ اس لئے کہ قرآن کریم کی رو سے، مملکت کسی خاص فرد کو نہیں، پوری کی پوری اُمت کو دی جاتی ہے۔ لہذا، اقتدار اسی کو مل سکتا ہے جسے اُمت یا بھی مشاورت سے اس کی اہل سمجھے۔

(۲)

وحدت اُمت

اسلام ایک اجتماعی نظام زندگی قائم کرتا ہے۔ یہ نظام جس قوم کے فہم و فہم قائم ہوتا ہے، وہ اسے اُمت تعمیر کرتا ہے۔ چونکہ اس اُمت کے تمام افراد کے لئے ایک ہی نظام ہوتا ہے اس لئے اُمت کی وحدت بھی اس کی لازمی شرط ہے۔ غلہذا، وحدت نظام اور وحدت اُمت لازم و ملزوم ہیں۔ اگر اُمت میں افتراق و انتشار پیدا ہو جائے تو وہ نظام بھی باقی نہیں رہتا۔ یالیوں کہیے کہ جب وہ نظام باقی نہ رہے تو اُمت کی وحدت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ پھر اس میں فرقے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ارشادات نبویؐ میں اسے تمسک بالجماعت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے: **وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا...** (مائدہ ۶۷) اے جماعت مومنین۔ تم سب مل کر۔ اجتماعی طور پر، خدا کی کتاب کے ساتھ تمسک رہنا اور فرقوں میں نہ بٹ جانا۔ جماعت، اسی جینا کی شکل کا نام ہے۔ محدث نے "بلی وحدت" کے عنوان سے، تمسک بالجماعت کی اہمیت پر تفصیل طور پر گفتگو کی ہے۔ اس نے لکھا ہے۔

بلی وحدت میں عناصر سے عبارت ہے جماعت۔ امیر اور فرو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لا اسلام الا بالجماعة، ولا جماعة الا بالامير، ولا امير الا بالسمع والاطاعة.

جماعت کے بغیر اسلام کی سر بندی ناممکن ہے اور امیر کے بغیر جماعت قائم نہیں رہ سکتی اور امیر

کی امارت اس وقت تک بار آور نہیں ہو سکتی جب تک کہ شخص اس کا حکم سن کر اس کی بات نہ مانے۔
اب اس ملی وحدت کو برقرار رکھنے کے لئے ارشادات نبویؐ ملاحظہ فرمائیے۔
فَلْيُؤْتُوا ذِكْرًا مِّنْ ذِكْرِ اللَّهِ عِندَ رَسُولِهِ يُذَكِّرُ (حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔
اِذَا يُدْعَىٰ خَلِيفَتَيْنِ فَاَقْتُلُوا الْآخَرَ مِنْهُمَا۔ (حکم کتاب الامارۃ والقضاء)
جب دو خلیفوں کی بیعت ہونے لگے تو بعد والے کو قتل کر دو۔
اور فقہائے اُمت کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ اگر ایک ہی وقت میں بغیر تقدیم و تاخیر دو خلیفوں
کا انتخاب واقع ہو تو دونوں کا انتخاب کا عدم قرار پائے گا اور نئے سرے سے خلیفہ کا
انتخاب ہوگا۔

امیر کی اطاعت و جماعت واجبگی | ارشاد باری ہے:۔
أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَ

أُولَى الْأَمْرِ مِنْكُمْ۔ (۴۹)

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ پھر حاکموں کی جو قسم ہیں سے ہوں۔
- اولی الامر سے خلیفہ کے علاوہ وہ دوسرے تمام حکام بھی مراد ہیں جو شورعی انتظامیہ یا عدلیہ
سے تعلق رکھتے ہیں۔

طلوع اسلام اس آیت (أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَ أُولَى الْأَمْرِ مِنْكُمْ) کا مفہوم یہ پیش
کرنا چاہا کہ ”اطاعت خدا اور رسول“ سے مراد اسلامی مملکت کی مرکزی اتھارٹی کی اطاعت ہے جو نظام
خداوندی کے قائم کرنے کی ذمہ دار ہے، اور اولی الامر منکم کی اطاعت سے مراد، اس مرکزی حکومت
کے مقرر کردہ، ماتحت عمال کی اطاعت۔ ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے، اس مفہوم کی مخالفت
ہوتی تھی۔ ان کے نزدیک اولی الامر سے مراد علماء حضرات ہیں جو ”امر بالمعروف اور نہی عن المنکر“
کے فریضہ کی ادائیگی کے ذمہ دار ہیں۔ غیبت ہے کہ محدث نے اس کا یہ مفہوم نہیں لیا اور کہا ہے
کہ اس سے مراد، شورعی، انتظامیہ، عدلیہ سے تعلق رکھنے والے حکام ہیں۔ لیکن اس میں.....
پھر ایک الجھاؤ پیدا کر دیا گیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ

اولی الامر سے خلیفہ کے علاوہ وہ دوسرے تمام حکام بھی مراد ہیں جو شورعی، انتظامیہ
یا عدلیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

رسول اللہؐ کی زندگی میں تو خلیفہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے محدث کا پیش کردہ
یہ مفہوم کہ اولی الامر سے خلیفہ اور اس کے علاوہ دیگر حکام مراد ہیں، اس نظام پر صادق نہیں آ سکتا
جس کے سربراہ حضورؐ تھے۔ اب ہم حضورؐ کے بعد اسلامی نظام، سو اگر اس میں خلیفہ بھی اولی الامر
میں شامل تھا، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ
(۱) خلیفہ کس کا مقرر کردہ ماتحت حاکم تھا؟

(۲) اور اگر خلیفہ ماتحت حکام میں شامل تھا تو اطاعت خدا اور رسول کی عمل شکل کیا تھی؟ کس کی اطاعت؟ خدا اور رسول کی اطاعت متصور ہوتی تھی؟

(۳) اگر خلیفہ کا شمار بھی ماتحت حکام میں ہوتا تھا تو نظام مملکت قائم کس طرح رہ سکتا تھا؟ نظام تو ایک مرکزی اتھارٹی (CENTRAL GOVT.) کا تقاضی ہوتا ہے۔

(۴) خلفائے راشدین مرکزی اتھارٹی کی حیثیت رکھتے تھے یا ماتحت حکام کی؟

اصل یہ ہے کہ ہمارے یہ قدامت پرست حضرات آجکل عجیب شناس میں گرفتار ہیں۔ اسلام کے متعلق قدم تصور ان کے قلب کی گہرائیوں میں پیوست ہیں۔ لیکن وہ تصورات عملاً اسلامی نظام میں فٹ نہیں بیٹھتے۔ یہ حضرات ان تصورات سے انکار بھی نہیں کر سکتے اور یہ کہنے کی بجائے کہتے ہیں کہ ان تصورات کی رد سے اسلامی نظام کا قیام ناممکنات میں سے ہے۔ وہ..... قدامت پرستی اور ماڈرنزم کے بیچ میں رہنا چاہتے ہیں لیکن ایسا ممکن نہیں۔ اس لئے ان کی یہ سعی لا حاصل عجیب مضحکہ انگیز صورت اختیار کر لیتی ہے۔ محدث نے خلیفہ کو اولی الامر (ماتحت حکام) میں شامل کر کے وقت سوچا ہی نہیں کہ اس کا اعلیٰ نتیجہ کیا نکلے گا؟

قرآن کریم کی رد سے، "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول" سے مراد، اسلامی نظام مملکت کی مرکزی اتھارٹی کی اطاعت ہے۔ حضور کی زندگی میں، یہ مرکزی اتھارٹی آپ خود تھے۔ حضور کے بعد، حضور کے خلفاء اور اولی الامر سے مراد مرکزی حکومت کے ماتحت حکام ہیں۔ حضور کی زندگی میں بھی، اور حضور کے بعد بھی، یہ نظام قرآن کی بنیادوں پر رہنا ہی میں قائم ہو سکتا ہے۔ اس نظام میں مرکزی اتھارٹی کی اطاعت، بمنزلہ اللہ اور رسول کی اطاعت کے ہوگی۔ اور اولی الامر کی اطاعت ماتحت حکام کی اطاعت ہے۔

(۱)

ملی وحدت کے متعلق محدث کی مزید تصریحات ملاحظہ فرمائیے۔ تحریر ہے: "ملی وحدت کے متعلق اب ارشادات نبویؐ ملاحظہ فرمائیے:-"

(۱) عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن عصانی عصی اللہ ومن اطاع امیری فقد اطاعنی ومن عصانی عصی امیری فقد عصانی۔ (بخاری۔ کتاب الاحکام)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اور جس نے میرے مقرر کئے ہوئے حاکم کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے گویا میری نافرمانی کی۔

(۲) عن عبد اللہ بن عمر یقول کنا نبایع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی السمع والطاعة یقول لنا فیما استطعتم۔

(مسلم۔ کتاب الامارۃ، باب البیعة علی السمع والطاعة۔ بخاری)

عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حکم سننے اور فرمانبرداری کرنے کی شرط پر بیعت کرتے تھے۔ آپؐ ہمیں کہتے: اپنی استطاعت کے مطابق (یا مشورہ پر) بھرتیسیں سمیع و طاعت لازم ہے۔

(۳) عن عروذجة قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول من اتاكم واموكم جميع على رجل واحد يري ان يشق عصاكم او يفوق جماعتكم فاقتلوه (مسلم، کتاب الامارۃ والقتاء)

عروذجہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے اگر تمہارا ہمارا کسی ایک شخص پر اکٹھے ہوں پھر کوئی شخص تمہاری قوت کو توڑے یا تمہاری جماعت میں تفرق ڈالنے کی کوشش کرے تو اسے قتل کر دو۔

(۴) عن ابی ہریرۃ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من خرج من طاعة وفارق الجماعة ثم مات، مات ميتة جاهلية (مسلم، کتاب الامارۃ)

ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو کوئی امیر کی اطاعت سے نکلے، اور جماعت سے الگ ہوا، پھر مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

امیر اگر نسل کے لحاظ سے گھبر یا شکل کے لحاظ سے یہ صورت ہو تو بھی اس کی اطاعت بہ طور واجب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

(۵) ان اوتبر علیکم عبد محدث یقر دکم بکتاب الله فاسمعوا له واطيعوا (مسلم، ایضاً)

اگر تم پر نیکو غلام بھی امیر بنا دیا جائے تو جب تک وہ تمہیں اللہ کے احکام کے مطابق چلاتا ہے۔ اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو۔

ایسے امیر کے احکام کی ہر حال میں سنی یا آسانی۔ وہ احکام رعایا کو پسند ہو یا ناپسند۔ اطاعت واجب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

(۶) السمع و اطاعة علی الامر المسلم فیما احب وکره مالم یؤمر بمعصية واذا امر بمعصية فلا سمع ولا طاعة۔ (متفق علیہ) (بخاری کتاب الاحکام)

”ہر مسلمان پر سننا اور طاعت کرنا لازم ہے خواہ وہ حکم اسے پسند ہو یا ناپسند جب تک کہ وہ گناہ کا حکم نہیں دیتا۔ اور اگر وہ گناہ کا حکم دے تو پھر نہ اس کی بات سنو نہ اطاعت کرو۔“

ضمناً۔ ان احادیث میں ”السمع والطاعة“ پر زور دیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں بھی ”سمعنا و اطعنا“ (۲) (و دیگر متعدد مقامات) آیا ہے۔ یعنی احکام کو سننا اور ان کی اطاعت کرنا۔ اس سے واضح ہے کہ اسلامی نظام کے لئے ایک زندہ اقتدار کی موجودگی لاینفک ہے جس کا حکم سنا جائے۔ محض کتابوں میں درج شدہ احکام کی اطاعت سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ محدث نے بھی اسے تسلیم کیا ہے جب کہا ہے کہ

ملت اسلامیہ کے لئے امام کے بغیر ایک لمحہ بھی گزارنا ناقابل برداشت ہے۔ (ص ۲۱)
لیکن "امام" ہر فرزند کو نہیں کہا جاسکتا۔ اسلامی نظام اور اس کے امام کی خصوصیات اور امتیازات قرآن کریم میں واضح ہیں۔ امت خلافت راشدہ کے بعد آج تک بلا امام چلی آرہی ہے لیکن جو اسلام اس دوران میں رائج تھا ہادی مذہبی پیشوا ثبیت اسے صحیح اسلام قرار دے رہی ہے اور اسی کے عملی نفاذ کی آپ کو تشویش ہو رہی ہیں۔

(۰)

مذہبی فرقے اور سیاسی پارٹیاں

وحدت امت کی اہمیت سامنے آنے کے بعد، مذہبی فرقوں اور سیاسی پارٹیوں کا سوال لازماً سامنے آنا چاہیے تھا۔ جہاں تک مذہبی فرقوں کا تعلق ہے، محدث نے لکھا ہے:-

تیسری لعنت وہ مذہبی فرقے ہیں جو اپنی الگ الگ فقہ کو سینے سے چٹائے ہوئے ہیں اور اس بات پر مصر ہیں کہ "کُلُّ جَزْبٍ مِّمَّا لَدَىٰ يَهُودَ فَرِحُونَ" (۱۳) سب فرقے اسی میں خوش ہیں جو ان کے پاس ہے۔ "کے مصداق جو کچھ ان کے پاس ہے بس وہی ٹھیک ہے۔ باقی سب غلط ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن تو سب کا ایک ہے۔ اور سنت بھی ایک ہے لیکن فقہ ہیں چار ہیں بلکہ اگر شیعہ حضرات کی فقہ جعفریہ بھی شامل کر دیں تو پانچ ہیں جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی فقہ دین کا حصہ نہیں ہے۔ (ص ۲۲)

آپ غور فرمائیے کہ فرقہ پرستی کس قسم کی ذہنیت پیدا کر دیتی ہے! محدث کا کہنا یہ ہے کہ

(۱) اہل فقہ کے فرقے تو لعنت ہیں، لیکن اہل حدیث کا فرقہ لعنت نہیں (کیونکہ یہ خود اس سے متعلق ہیں)۔ اور "کُلُّ جَزْبٍ مِّمَّا لَدَىٰ يَهُودَ فَرِحُونَ" کا اطلاق ان پر ہوتا ہے، ان پر نہیں ہوتا! ہر فرقہ یہی کہہ کہ فرقہ پرستی کو مستحکم رکھتا ہے۔ اور یہ قرآن کی تہ سے شرک ہے۔ (۱۴)

(۲) محدث کا کہنا ہے کہ قرآن سب کا ایک ہے اور سنت بھی ایک ہے۔ ہم اپنے اس معاصر سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ کونسی کتاب ہے جس میں مندرج "سنت" کو تمام فرقے متفقہ طور پر سنت تسلیم کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ہر فرقہ اپنے مسلک اور اپنے شرعی احکام کو سنت پر مبنی قرار دیتا ہے۔ سنت کا یہی اختلاف تو تھا جس کے پیش نظر مودودی (مرحوم) نے کہا تھا کہ کتاب و سنت کی بنا پر پاکستان میں کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ یہ کہنا کہ سنت سب کی ایک ہے بہت بڑی مغالطہ آفرینی ہے۔ زبان سے سب یہی کہتے ہیں اور علماء ہر ایک اس کی تفسیل کرتا ہے۔ اگر کتاب و سنت ہر ایک کی ایک ہی ہے تو آپ شرعی اداروں میں اپنے فرقہ کی الگ نمائندگی کا مطالبہ کیوں کرتے ہیں؟

(۳) ان فرقوں کا اختلاف تو نماز، روزہ وغیرہ احکام کی ادائیگی میں سامنے آتا ہے۔ ہم سے جب پوچھا جاتا ہے کہ ان اختلافات کی شکل میں کیا کیا جائے، تو ہمارا جواب یہ ہوتا ہے کہ اس وقت مختلف فرقے جس طرح ان کی ادائیگی کر رہے ہیں، ان پر کوئی اعتراض نہ کیا جائے۔ نہ کوئی نیا طریق وضع کیا جائے۔ نہ مروجہ طریقوں میں کسی قسم

کا رد و بدل کیا جائے۔ جب کبھی اسلامی مملکت وجود میں آئے گی تو جس شکل کو وہ مقرر کرے گی اس کا اتباع ساری قوم کے لئے لازمی ہوگا۔ یوں یہ اختلافات رفع ہو سکیں گے۔ محدث نے بھی یہی حل بتایا ہے۔ لکھا ہے۔

اس کا دوسرا حل یہ بھی ہے کہ ایسے فردی مسائل جن میں ہر فرقہ کے پاس اولیٰ مشروعیت موجود ہوں۔ (جیسے حنفی۔ شافعی وغیرہ کے مختلف فیم مسائل) ان میں سے کسی ایک بجانب کو اگر امیر یا خلیفہ متعین کر کے لوگوں کو اس پر عمل کرنے کا حکم دے تو ان کا فرض ہوگا کہ اس کا اتباع کریں۔ اگرچہ حیثیت حنفیت یا شافعییت اس کے مذہب کے خلاف ہو۔ (صفحہ ۲۲)

امیر ہے اہل حدیث بھی اسے تسلیم کر لیں گے:

(۴) تشکیل پاکستان کے فوری بعد ہم نے لکھا تھا کہ ہندوستان سے جو مسلمان ادھر آ رہے ہیں وہ کوئی نہ کوئی ایسا ہنر جانتے ہیں جس سے وہ مسائل میسر آجائے گے بعد ازاں اپنی روٹی کما لینے کے قابل ہو جائیں گے۔ لیکن ایک طبقہ ایسا ہے جو کوئی ہنر نہیں جانتا اور دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ ہے ہمارے مذہبی پیشواؤں کا طبقہ جو مجرم کہے ادھر آ رہے۔ ان کا بسیرا پرستش گاہوں میں ممکن تھا لیکن مشکل یہ ہے کہ غیر مسلموں کی متروکہ پرستش گاہیں۔ (مندرجہ ذیل) گورو دارے) انہیں الاٹ نہیں کئے جاسکتے۔ اور مساجد میں پہلے سے امام اور مؤذن موجود ہیں۔ لہذا ان کی روزمی کا مسئلہ مشکل پیدا کر دے گا۔ ہم نے حکومت سے کہا تھا کہ وہ ان کی کفالت کا ذمہ لے لے اور آئندہ اس قسم کے بے ہنر افراد پیدا نہ ہونے دے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو یہ بے ہنر، بے کار افراد حصولِ رزق کیلئے غلام کیا کیا حربے اختیار کریں؟ اس سے ملک کو عجیب قسم کی نازک مشکلات کا سامنا کرنا پڑ جائے گا۔

ہماری اس بات پر کسی نے کان نہ دھرا، اور اس کا جو نتیجہ نکلا وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ پاکستان کا مشکل ترین مسئلہ یہی بن گیا ہے!

محدث نے ہماری ہم فوا میں لکھا ہے کہ

اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ فردی اختلاف کو ہوادینے والا علمائے سوء کا وہ گردہ ہے جس کا روزگار ان مسائل سے وابستہ ہے۔ اگر علماء اور ائمہ مساجد کی کفالت کی ذمہ داری حکومت لے لے، جس طرح سعودی عرب میں ہے، تو یہ تفریق و انتشار کی فضا بہت کم کی جاسکتی ہے۔

صفحہ ۲۲-۲۳۱

ان حضرات کی یہ خاص ٹیکنیک ہے کہ جب ان حضرات سے علماء کی فراہمیوں کا اعتراف کئے بغیر بن نہیں پڑتی، تو کہہ دیتے کہ یہ علماء سوء کی خرابیاں ہیں، لیکن کبھی یہ نہیں بتاتے کہ یہ "علماء سوء" کون کون سے ہیں۔ ان میں سے ہر شخص اپنے ان کے علماء کو علماء حق قرار دیتا ہے اور دوسروں کے علماء کو علماء سوء۔

محدث کا ارشاد ہے کہ یہ مسائل ان علماء سوء کا ہے جن کا روزگار ان مسائل سے وابستہ ہے۔ کیا ہم اپنے معاصر سے یہ پوچھ سکتے ہیں کہ علماء حق کے روزگار کا ذریعہ کیا ہے؟ یہ جو ہوائی جہازوں میں ساری دنیا کا چکر لگاتے اور پانچ پانچ سٹار ہوٹلوں میں مہینوں قیام فرماتے ہیں، ان کا ذریعہ معاش کیا ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ موجودہ علماء سود اور ائمہ مساجد کی کفالت کا ذمہ حکومت نے بھی لے لیا، تو اس انبوہ عظیم کی کفالت کیسے ہو سکے گی جو ہر سال سیلاب کی طرح، مکتبوں اور دارالعلوموں سے برآمد ہوتا رہتا ہے؟ اگر ہمارے ان اعداد و شمار بڑھتے تو دیکھنے والے دیکھتے کہ ملک کے دفاع پر شاید اتنا خرچ نہیں ہو رہا جتنا خرچ اس طبقہ پر ہو رہا ہے جو ملک کی پیداوار میں ایک پائی کا بھی اضافہ نہیں کرتا۔ اس ملک کی معیشت کبھی سنبھل نہیں سکتی جس میں حجم خفیران لوگوں کا بوجھن کا ملک کی پیداوار میں کچھ حصہ نہ ہو۔ اور جو دوسروں کی کمائی پر مرفہ الحالی کی زندگی بسر کرتے ہوں۔ اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ جنہیں کچھ کام کئے بغیر مفت کی روٹی ملتی ہو، ان کا مشغلہ اس کے سوا کچھ نہ ہے جو اقبالؒ نے کہا تھا کہ

کارِ مِلّٰتی سبیل اللہ فساد!

سیاسی پارٹیاں

محدث نے یہ بھی لکھا ہے کہ ملک میں سیاسی پارٹیاں نہیں ہوتی چاہیں کیونکہ ان سے اتراق اور انتشار پھیلتا ہے۔ لیکن ایسا لکھنے وقت اس کے سامنے مذہبی فرقے بھی تھے (جنہیں وہ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے لعنت قرار دے چکا ہے)۔ اس باب میں اس کی کش مکش دید کے قابل ہے۔ لکھا ہے:-

سیاسی جماعتوں کے وجود کے جواز میں یہ دلیل بھی پیش کی جاتی ہے کہ اگر فقہی اختلاف، یا مذہبی فرقوں کا وجود برداشت کر لیا گیا ہے تو آخر سیاسی اختلاف اور سیاسی جماعتوں کے وجود کو کیوں نابالغ سمجھا جاتا ہے؟ ہم یہ عرض کریں گے کہ فقہی اختلاف سے مراد قرآن و سنت کی تعبیر کا اختلاف ہے۔ قرآن و سنت کے علاوہ کچھ نہیں لیکن اس اختلاف میں بھی جب خصیبت پیدا ہو جائے اور فرقہ پرستی تک لوہٹ پہنچ جائے تو یہ بھی کفر ہے۔ پھر ایک غلط بات کو جائز قرار دے کر اس کو دوسری غلط چیز کے لئے بنیاد قرار دے دینا کہاں تک درست ہے؟ سیاسی اختلاف ہونا ایک فطری بات ہے لیکن اس اختلاف کو عقیدہ کا رنگ دینا پھر اپنے ہم خیال لوگوں کا منظم ہونا اور پھر حصول اقتدار کے لئے کوشش کرنا اور پھر اسے درست سمجھنا اور اس پر اٹھ کر رہنا ایک گمراہ کن امر ہے۔

مذہبی فرقوں اور سیاسی فرقوں میں دو سرفرق یہ ہے کہ مذہبی قائدین نے کبھی اپنے قیاس و مسلک کو قابل اتباع قرار نہیں دیا کہ اس عقیدہ کو لوگ اپنا فرقہ بنائیں اور اگر لوگ بنالیں تو تو ان کی اپنی غلطی ہے جس سے قائد بننا ہوتا ہے۔ جبکہ سیاسی جماعتوں میں ایسی تنظیم بنانا لازمی شرط ہے۔ اور ان قائدین کا یہی مقصد ہوتا ہے۔

اور تیسرا فرق یہ ہے کہ مذہبی فرقوں کا مقصد عوام کی اکثریت کو اپنے ساتھ ملانا اور اقتدار پر قبضہ یا اس کے حصول کی کوشش کرنا نہیں ہوتا جبکہ سیاسی جماعتوں کا اصل مقصد وہی ہوتا ہے

کہ ملک میں اپنی اکثریت پیدا کرنے کے لئے نشست و انتشار پیدا کیا جائے اور پھر اس راستہ سے حکومت میں سے معتبر رسی حاصل کرنے کے لئے راستہ ہموار کیا جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس بوکھلاہٹ پر کوئی تبصرو نہ کرنا ہی مزدوں تو ہیں تبصرہ ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اپنے غلط مسلک کو صحیح ثابت کرنے کے لئے انسان کس قسم کی لاطائل باتیں کرنے لگ جاتا ہے۔

(۱)

اجماع امت

ہمارے ہاں، کسی عقیدہ، قانون یا مسلک کے "اسلامی ہونے کی ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ امت کا اس پر اجماع ہے۔ یہ تو امر سے ثابت ہے۔ سلف صالحین کا مسلک یہی ہے۔ وغیرہ۔ محدث اس باب میں لکھتا ہے: اجماع صحابہؓ کے حجت ہونے میں تو کسی کو کلام نہیں، لیکن مابعد کے امداد کا اجماع کا حجت ہونا بذات خود مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ اور راجح قول یہی ہے کہ مابعد کا اجماع امت کے لئے قابل حجت نہیں۔

صحابہؓ کا اجماع تو ثابت کیا جاسکتا ہے کیونکہ ان کا زمانہ بھی محدود اور علاقہ بھی محدود تھا۔ لیکن مابعد کا اجماع ثابت کرنا بھی بہت مشکل ہے جبکہ امت اقصائے عالم میں پھیل چکی ہے اور علماء بھی ہر جگہ موجود ہیں۔ (ص ۱۹۲)

مابعد کے اختلافات کو تو چھوڑیے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (مرحوم) نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ہے "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" اس کا حال ہی اردو ترجمہ "فقہی اختلافات کی اصلیت" کے نام سے، علماء اکیڈمی، محکمہ اوقاف پنجاب کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ اس کے پہلے باب کا موضوع ہے: فروعات میں صحابہؓ اور تابعینؓ کے اختلافات کے اسباب کا بیان۔

اس میں شاہ صاحب (مرحوم) نے صحابہؓ کے اکثر اختلافات کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے:

انہیں حالات صحابہؓ کے درمیان جو اختلاف کا آغاز ہوتا ہے اس کی چند بنیادیں تھیں۔ (ص ۱)

اور پھر ان بنیادوں کی وضاحت کرنے کے بعد لکھا ہے:

الفرض صحابہؓ کے امام ہونے کے مذاہب مختلف ہوتے، وہ ان میں سے تابعین کے جس میں سہولت دیکھی اختیار کر لیا۔ (ص ۱۲)

لہذا، اجماع تو (ان تحقیقات کی روش سے) صحابہؓ میں بھی نہیں تھا۔ اس لئے محدث "اس اجماع کو سند کس طرح قرار دے سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اہل حدیث حضرات مابعد کے اجماع یا امت کے تو امر اور اس کے سوا د اعظم ہونے کو اس لئے سند تسلیم نہیں کرتے کہ وہ اس میں کوئی مدنی سبق دیکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امت کی اکثریت ہمیشہ اہل فقہ کی رہی ہے۔ انہی کے مسلک کو امت کا اجماع، یا قوام، یا سواد اعظم کا مسلک کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اہل حدیث حضرات اسے سند تسلیم کر ہی نہیں سکتے۔

یاد رکھیے! دین میں سند صرف کتاب اللہ کی ہے۔ جب تک اُمت اس مرکز پر نہیں آئے گی اس کے اختلافات رفع نہیں ہو سکیں گے۔

(۰)

آہ بیچارہ عورت!

یہ تو نہیں ہو سکتا کہ یہ حضرات "اسلامی نظام" کی بات کریں اور عورت کو فحاشی کر دیں، چنانچہ محدث نے اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے اور (حسب معمول) اس جنس مظلوم کو خوب خوب رگسب دیا ہے۔ فرماتے ہیں:-

اسلام مساوات مرد و زن کا ہرگز قائل نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کی شہادت کو مکمل نہیں بلکہ نصف قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

.....وَأَسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ فَرِحْتُمَا بِمَا لَمْ يَكُنْ لَكُمَا فَرِحْتُمَا بِهِ فَرَحُ الْمَرْءِ لَمَّا كَانَ مِنَ الْمَوْلَا وَمَنْ أَمَّا الْفُلْ لَمْ يَكُنْ لَكُمَا فَرِحْتُمَا بِهِ فَرَحُ الْمَرْءِ لَمَّا كَانَ مِنَ الْمَوْلَا وَمَنْ أَمَّا الْفُلْ لَمْ يَكُنْ لَكُمَا فَرِحْتُمَا بِهِ فَرَحُ الْمَرْءِ لَمَّا كَانَ مِنَ الْمَوْلَا (۲/۲۸۲)

اور اپنے میں سے دو مردوں کو گواہ بنالیا کرو۔ اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جن کو تم گواہ بنانا پسند کرو۔

صرف یہی نہیں بلکہ میراث میں بھی عورت کا حصہ مرد سے نصف ہے۔ اور عبادت میں بھی عورت، مرد کے برابر نہیں۔ حیض و نفاس کے ایام میں عورت سے نماز ساقط ہو جاتی ہے، انہی وجوہ کی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے عورت کو "ناقص العقل والدین" کہا ہے۔

اور امارت و سیاست کے معاملات میں تو عورت کی شمولیت کو اسلام نے ہرگز پسند نہیں کیا۔ نہ ہی خلفائے راشدینؓ کے انتخاب میں عورت کے ووٹ کی کوئی مثال ملتی ہے۔ (مسئلہ)

اس کے بعد مختلف دوائر حیات کا ذکر کرنے کے بعد، مختصراً کہا ہے کہ عورت کا دائرہ کار صرف گھر کی چار دیواری ہے۔ قرآن کریم کی طرف تو ہم بعد میں آئیں گے۔ پہلے ایک دلچسپ تقابلی ملاحظہ فرمائیے۔ کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عورت کو "ناقص العقل والدین" قرار دیا ہے۔ یعنی عقل اور دین دونوں میں ناقص۔ لیکن وہی برق بھری رسول اللہ کی دو احادیث نقل کی ہیں، جن میں سے ایک میں:-
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی کو حرام کیا ہے۔

اور دوسری میں یہ کہ

ماؤں کے قدموں میں جنت ہے۔ (مسئلہ)

یعنی جس عورت کو رسول اللہ ﷺ نے دین اور عقل دونوں میں ناقص قرار دیا ہے، اسی عورت کے متعلق ارشاد ہے کہ اس کی نافرمانی کو خدا نے حرام قرار دیا ہے۔ آپ اندازہ فرمائیے کہ عقل اور دین دونوں میں ناقص جنس جس قسم کے احکام دے گی، وہ عقل اور دین کے اعتبار سے کسی قسم کے جوں گے، اور جو قوم اس قسم کے احکام کی نافرمانی کو

(حکیم خداوندی) حرام سمجھے گی، اس کا مقام کیا ہوگا؟ اتنا ہی نہیں۔ اس ناقص العقل والدین کے متعلق فرمایا کہ اس کے قدموں میں جنت ہے! ان حضرات کے پیش کردہ اور صحیح قرار دادہ، ان ارشادات نبویؐ کی روش سے جو لوگ جنت میں جانے کے مستحق قرار پائیں گے ان کی عقل اور دین کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے!

اب آئیے قرآن کریم کی طرف! یہ حضرات اول تو قرآن کریم کی طرف آتے ہی نہیں۔ اور اگر انہیں اپنی مصلحت کی بنا پر مجبوراً آنا پڑتا ہے تو اس میں کھلے بندوں شریف کرتے ہیں۔ اس آیت کو لیجئے جس کی بنا پر انہوں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کی شہادت کو مرد کے مقابل میں نصف قرار دیا ہے۔ انہوں نے جو آیت (۸۴) درج کی ہے وہ پوری آیت نہیں۔ انہوں نے اس کا اگلا حصہ حذف کر دیا ہے۔ اس بقیہ حصہ کے ساتھ آیت یوں ہے:-

وَأَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا وَحِدَيْنِ فَرَجُلٍ وَ
مَرَأَتَيْنِ يَتَرَفَعُونَ مِنَ الشَّهَادَةِ أِنَّ تَفْصِيلَ أَحَدَهُمَا فَتَدْكِرُ إِحْدَهُمَا
الْأُخْرَىٰ ۚ..... (۲۸۷)

شیخ الہند مولانا اجمود الحسنؒ اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:-

اور گواہ کرو دو شاہد اپنے مردوں میں سے۔ پھر اگر نہ ہوں دو مرد، تو ایک مرد اور دو عورتیں،
ان لوگوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو گواہوں میں تاکہ اگر بھول جائے ان میں سے ایک
تو یاد دلادے اس کو دوسری۔

آپ قرآن کریم کی حکمت بالغہ پر غور کیجئے۔ اس نے صرف اتنا ہی نہیں کہا کہ اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں
بطور گواہ بلاؤ۔ اس نے اس کے ساتھ یہ بھی واضح کر دیا کہ یہ دوسری عورت کس مقصد کے لئے بلائی جائے گی؟
صرف اس مقصد کے لئے کہ اگر وہ گواہ (عورت) کہیں بھول جائے تو یہ دوسری عورت اسے یاد دلادے۔
اس سے واضح ہے کہ

(۱) پہلی عورت اگر کہیں بھول جائے تو دوسری عورت کا صرف اتنا فریضہ ہوگا کہ وہ اسے یاد دلادے!
اور جس — یہ نہیں کہا کہ اس کی جگہ یہ شہادت دینے لگ جائے۔

(۲) اگر پہلی عورت غلطی نہ کرے تو دوسری عورت کا کوئی (FUNCTION) ہی نہیں ہوگا۔

(۳) قرآن کریم نے کہیں نہیں کہا کہ پہلی عورت کی گواہی دینے کے بعد، دوسری عورت بھی گواہی دے،
اور اس طرح دو عورتوں کی گواہی مل کر ایک مرد کے برابر ہو جائے۔

ان سے پوچھئے کہ خدا نے کہاں، عورت کی شہادت کو مرد کی شہادت سے نصف قرار دیا ہے؟
غور کیجئے کہ یہ قرآن میں کھلی ہوئی تحریف ہے یا نہیں؟

اگرچہ یہ اس نقطہ کا تعلق موضوع زیر نظر سے نہیں، لیکن ہم (ضمناً) یہ بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ،
قرآن کریم نے اس دوسری عورت کی ضرورت کیوں قرار دی ہے۔ نزدیکی قرآن کریم کے وقت، عربوں نے اپنے
معاشرہ میں عورت کی جو حالت بنا رکھی تھی اس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ

أَوَمَنْ يُنَشِّئُوا فِي الْجَنَّةِ وَهْوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرَ مُبِينٍ (۳۸)

رپورٹ میں پتی ہوئی اور کیفیت یہ کہ خود اپنے کیس (معاملہ) کو بھی واضح طور پر بیان کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

اس قسم کی پرورش یافتہ عورت تو ایک طرف، آپ ہمارے زمانے کی کسی پڑھی لکھی خاتون کو سہلی بار کچھ ہی میں لے جائیے اور پھر دیکھئے کہ اجنبی مردوں کے ہجوم، اور دکھانے کے حوالات کی بوجھاڑ میں اس کی نمائندگی کیا ہوتی ہے، قرآن کریم نے جو کہا ہے: **أَنْ تَضِلَّ أَحَدُهُمَا**۔ تو ضلّ کے معنی بھول جانا ہی نہیں (CONFUSE) ہو جانا بھی ہے۔ ایسے ماحول میں اس نووارد خاتون کا (CONFUSE) ہو جانا عین ممکنات میں سے ہے۔ قرآن نے اس کی اس نفسیاتی کیفیت کے لئے بطور مدد و ایہ تجویز کیا کہ عدالت کے کٹھن سے ہیں، اس کی کوئی جاننے پہچاننے والی عورت اس کی کوئی سہلی، اس کے ساتھ کھڑی رہے۔ اس سے اس کے اوسان بجا رہیں گے۔ اور اسے اس کا اعتماد ہوگا کہ اگر اس سے کہیں کوئی تسامح ہو جائے گا تو اس کی ہم دوش اسے یاد دلادے گی۔ یہ تھا قرآن کریم کا مقصد گواہ عورت کے ساتھ، اس کی ہم دوش کی موجودگی سے!

واضح رہے کہ قرآن کریم نے یہ کیفیت، اس ماحول میں پرورش پانے والی عورتوں کی بتائی ہے۔ یہ کہیں نہیں کہا کہ عورت، عورت ہونے کی جہت سے ناقص العقل ہوتی ہے۔ ان کی مناسب تعلیم و تربیت سے وہ زندگی کے ہر گوشے میں مردوں کے ہم دوش چلنے کے قابل ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم نے، ہر شعبہ حیات میں مومن مردوں اور مومن عورتوں کے ہم قدم چلنے کا ذکر کیا ہے۔ مرقفصیل کے لئے پروردگار صاحب کی کتاب ظاہرہ کے نام خطوط دیکھئے (۲) محدث نے یہ بھی لکھا ہے کہ میراث میں بھی عورت کا حصہ مرد سے نصف ہے۔ ان حضرات کی مشکل یہ ہے کہ تو، دس دس سال کے عرصہ دراز میں جس نصاب تعلیم کے ختم ہونے پر انہیں عالم ہونے کی سند ملتا ہوتی ہے، اس نصاب میں قرآن شامل نہیں ہوتا۔ سال آخر میں، صرف سورۃ البقرہ کی تفسیر تیار کر دیا جاتا ہے۔ اگر قرآن مجید ان کی تعلیم میں شامل ہوتا تو یہ اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ باتیں نہ کہتے کہ میراث میں بھی عورت کا حصہ مرد سے نصف ہے۔ ہم پوچھتے ہیں اپنے اس معاشرے کہ کیا قرآن کریم کے یہ احکام بھی کبھی ان کی نظر سے گزرے ہیں کہ

(۱) وَلَا تَرِثُنَّ زَكَاةً مِنْكُمْ وَلَا تَرِثُنَّ مِمَّا تَدُلُّ (۴۱)

موتوں کے ترکہ میں، اس کی مال اور باپ میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے۔

اس میں عورت (مال) کا حصہ مرد (باپ) کے برابر ہے۔ نصف نہیں۔

(۲) کلامہ کے ترکہ کی تقسیم کے متعلق فرمایا کہ

..... وَلَهُ آخِ الْأَخْتِ قُلُوبُ وَاحِدٌ مِّنْهُمَا الشُّدُ (۴۲)

اس کے بہن اور بھائی دونوں میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے۔

اس میں عورت (بہن) کا حصہ مرد (بھائی) کے برابر ہے۔ نصف نہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ حدیث کا بیان کردہ کلیہ کہ "میراث میں عورت کا حصہ مرد سے نصف

ہے۔ غلط ہے۔ قرآن میں جہاں لڑکی کا حصہ لڑکے سے نصف کہا گیا ہے، وہ لڑکی کے عورت ہونے کی جہت سے نہیں۔ اس کے مصالح اور ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

(۳) محدث نے یہ بھی کہا ہے کہ

امارت اور سیاست کے معاملات میں تو عورت کی شمولیت کو اسلام نے

ہرگز پسند نہیں کیا۔ (ص ۱۳)

قرآن کریم میں سیاست و امارت (یعنی امور مملکت) کے سلسلہ میں ہے:-

أَتَيْنَتْ إِنْ مَشَتْهُمْ فِي الْأَمْثِلِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَآمَرُوا
بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (۲۲)

یہ (مومنین) وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم نے انہیں ملک میں حکومت عطا کی تو یہ اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کریں گے۔

اس سے واضح ہے کہ اسلامی حکومت کا فریضہ اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کریم نے اس فریضہ حکومت کو مردوں کے لئے مختص اور عورتوں کو دیا ہے یا اس میں عورتوں کو بھی شریک کیا گیا ہے۔ سورۃ التوبہ میں ہے:-

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ كَذَاتِهِمْ أَزْوَاجٌ يُبَايِعُونَ بِأَمْوَالِهِمْ بِالْمَعْرُوفِ
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ (۹)

مومن مرد اور مومن عورتیں، ایک دوسرے کے دوست اور بھی خواہ ہیں۔ ان کا فریضہ اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔

آپ دیکھتے کہ، جن اور کو اسلامی حکومت کا فریضہ قرار دیا گیا ہے، ان میں مردوں اور عورتوں دونوں کو یکساں شریک کیا گیا ہے۔ غور کیجئے کہ یہ حضرات کس طرح اسلام کے نام پر خلافِ قرآن تعلیم پیش کرتے ہیں!

(۱۰)

رحیم کی سزا

محدث نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں جب حضرت معاویہؓ جبلِ بطور سفیر رومی دربار میں گئے تو دورانِ گفتگو بات بادشاہ کے اختیارات کے متعلق چھیڑ گئی۔ آپؓ نے ان سے فرمایا:-
تم کو اس پر ناز ہے کہ تم ایسے شاہنشاہ کی رعایا ہو جس کو تمہاری جان و مال کا اختیار ہے
لیکن ہم نے جس کو اپنا بادشاہ بنا رکھا ہے وہ کسی بات میں اپنے کو تہہ جہم نہیں دے
سکتا۔ اگر وہ ناکرے تو اس کو قریب لگائے جائیں (ص ۱۶۶)

ظاہر ہے کہ خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ (جن کے متعلق بات ہو رہی تھی) شادی شدہ تھے۔ اگر شادی شدہ

زانی کی سزا رجم تھی تو حضرت معاذ کو یہ کہنا چاہیے: انہوں نے دُروں کی سزا بتائی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں شادی شدہ زانی کی سزا کوڑے تھی۔ رجم نہیں تھی۔

(۰)

اسلام اسی کا نام نہیں!

محدث نے مہاشرقی مساوات کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ جب کسی کو عامل مقرر کرتے تو ان سے مندرجہ ذیل باتوں کا عہد لیا جاتا تھا۔

(۱) ترک گھوڑے پر سوار نہیں ہوگا۔

(۲) باریک کپڑے نہ پہنے گا۔

(۳) چھٹا ہوا آٹا نہ کھائے گا۔

(۴) دربان نہ رکھے گا۔۔۔ اہل حاجت کے لئے دروازے ہمیشہ کھلے رکھے گا۔

ایک بار حضرت عمرؓ بازار میں پھر رہے تھے۔ ایک طرف سے آواز آئی کہ عمرؓ! کیا عالموں کے لئے چند قواعد مقرر کر دینے سے تم عذاب الہی سے بچ جاؤ گے؟ تم کو یہ خبر ہے کہ عیاض بن غنمؓ جو مصر کا عامل ہے باریک کپڑے پہنتا ہے اور دروازے پر دربان مقرر ہے۔

اس کے بعد لکھا ہے:-

حضرت عمرؓ نے (حضرت) عیاضؓ کو مدینہ بلوایا۔ ان کا باریک کمرہ اتروا کر کبل کا کمرہ پہنایا اور بکریوں کا ایک گلہ منگوا کر حکم دیا کہ جنگل میں جا کر چراؤ۔ (ص ۱۶۲)

کس قدر صحیح کہا تھا اس کہنے والے نے کہ "اے عمرؓ! تم عالموں کے لئے چند قواعد مقرر کر دینے سے خدا کے عذاب سے نہیں بچ سکتے۔" اسلام... قواعد مقرر کر دینے اور پسند قوانین نافذ کر دینے کا نام نہیں یہ تو تکبریم آدمیت اور مساواتِ انسانیہ کے عملی نظام کا نام ہے۔ اس میں جو عامل، کبل کا کمرہ پہن کر بکریاں چرانے نہیں جانتا، امور مملکت میں شرکت کا اہل نہیں ہو سکتا۔ اور جو سربراہ مملکت، سر بازار اس قسم کی تنقید، خندہ پیشانی سے نہیں سن سکتا، اور اس پر عمل کرے اور کرا نہیں سکتا، وہ مستحقِ خلافت نہیں قرار پا سکتا۔

(۰)

خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں تاکہ خریدار صاحبان! جواب میں تاخیر نہ ہو۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ لکھیں اور پچھتے پچھتے کی صورت میں ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ سے پہلے اطلاع دیں۔ (ناظم ادارہ)

(۰)